الایام: مجلس برائے تحقیق اسلامی تاریخ وثقافت، کراچی جلد:۳، شمارہ:۲، جولائی۔دسمبر ۲۰۱۲ء

موت وحیات کا قرآنی ومغربی تصور

محمد شکیل اوج

The Comparison of Western and Quranic Concept of Life and Death

Human Being is the composition of (both) body and soul. The verse خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ depicts that death doe's not merely mean annihilation or simply plundering life; rather it is a creation which has its own permanent entity. The Quranic words like تُوَفَّوْنَ and تُرْجَعُونَ are obvious evidence that death is not just nothingness and only mortality; rather the return towards Allah after death and getting rewards for ones deed is absolute.

Whereas, in western conception, death is nothing but the cessation and this concept of life has made them inconsiderate about Hereafter. Thus life is solely means the accomplishment of corporeal desires; in which eating, drinking and executing intimate lust are the only objectives. This western idea is nothing new; as at the time of the revelation of Quran those who refuted the Prophet of Islam had the same conception about hereafter.

In Quranic view, every deed of human being has its effect on his personality and the individual lives on these traits and keeps on ensue even after death. Therefore, deed without its consequence is out of question. These traits are called Nama-e- Amal (the chronicle of deeds). Today, these are hidden from our eyes, but on the Day of Judgment these will become visible, as the writing written with the juice of lemon is visible automatically in front of fire.

اللہ تعالیٰ نے اپنی کائنات میں دیگر مخلوقات کے ساتھ ایک شاہکار مخلوق، حضرت انسان کو بھی تخلیق فرمایا ہے، جو جسم و نفس کے ساتھ ساتھ (دُہری) موت حیات سے بھی عبارت ہے۔ الذی خلق الموت والحیاۃ لیبلوکم ایکم احسن عملا ۔(۱) وہ ذات جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تا کہ تمھیں آزمائے کہ تم میں سے کون اچھے عمل کرتا ہے۔ خلق الموت کے لفظ سے پتہ چلتا ہے کہ موت عدم محض یا فقط سلبِ حیات کا نام نہیں بلکہ وہ ایک مستقل وجودی مخلوق ہے، جس طرح حیات اور وجودِ حیات کا ظرفِ عمل بننا خود حُسنِ عمل کی بنیاد ہے۔ یعنی اگر وجودِ حیات نہ ہوتا تو عمل کیسے ممکن ہوتا؟ اور اگر موت کی تخلیق نہ ہوتی تو حُسنِ عمل پر اجر کیسے ملتا؟ گویا موت، حُسنِ عمل کیلئے بمنزلۂ شرط کے ہے۔ اسی حقیقت کو قرآن مجید نے دو لفظی فقروں میں یوں سمو دیا ہے۔ کل نفس ذائقہ الموت ثم الینا ترجعون ۔(۲) ہر نفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ پھر تم سب ہماری ہی طرف واپس لائے جاؤ گے۔ کل نفس ذائقہ الموت و نبلوکم بالشر والخیر فتنہ والینا ترجعون ۔(۳) ہر نفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے اور کھوٹا کھرا الگ کرنے کیلئے ہم تمھیں دکھ اور سکھ سے آزماتے ہیں اور بالآخر تم ہماری ہی طرف لوٹائے جاؤ گے۔۔۔ کل نفس ذائقۃ الموت و انما تو فون اجورکم یوم القیامہ (۴) ہر نفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے اور تم سب کو قیامت کے دن ہی پورا پورا اجر دیا جائے گا۔

ان آیات میں موت کے بعد تُرجَعُون اور تُوَفُّون کے الفاظ اس امر پر صراحت کیلئے کافی ہیں کہ موت، عدمِ محض یا فنائے محض کا نام نہیں ہے بلکہ موت کے بعد اللہ کی طرف پلٹنا اور اپنے اعمال پر بدلے کا پانا بھی یقینی ہے۔ گویا بقولِ اقبالؒ:

تو اسے سمجھا ہے غافل اختتام زندگی
ہے یہ شامِ زندگی، صبح دوامِ زندگی

یہ ہے اسلام کا تصورِ موت و حیات۔

جبکہ مغربی تصورِ حیات میں موت، فنائے محض کے سوا کچھ نہیں۔ زندگی کے اسی تصور نے انہیں حیات بعد الموت سے بے پروا کر رکھا ہے اور زندگی فقط طبیعی تقاضوں کی تکمیل سے عبارت ہو کر رہ گئی ہے۔ جس میں کھانا پینا، اور جنسی آسودگی حاصل کرنا بجائے خود، مقصودِ حیات بن چکا ہے۔ مغرب کا یہ تصور کوئی نیا تصور نہیں ہے بلکہ دورِ نزولِ وحی میں مخالفینِ نبوت کا تصورِ حیات بھی یہی تھا۔ والذین کفروا یتمتعون

ویا کلون کما تاکل الانعام۔(۵) اور حقیقت کا انکار کرنے والے، چند روزہ فائدے اٹھاتے ہیں اور جانوروں کی طرح کھاتے (پیتے) ہیں۔ (اور مرجاتے ہیں) اس تصورِ زندگی کا نتیجہ شرفِ انسانیت کی تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ حیوانوں کی طرح جئے اور حیوانوں کی طرح مرگئے۔ اسی لیے وہ کہتے تھے۔ ثم اذا متنا و کنا ترابا عظاما ءَ انا لمدینون۔(۶) جب ہم مرجائیں گے اور مٹی اور ہڈیاں ہوجائیں گے تو (کیا اسکے بعد دوبارہ زندہ کئے جایں گے تاکہ) بدلہ دیئے جائیں: ءَ اذا کنا عظاما و رفاتاءَ انا لمبعوثون خلقا جدیدا (۷) جب ہم (مرکر بوسیدہ) ہڈیاں اور ریزہ ریزہ ہوجائیں گے تو کیا ہمیں از سرِ نو پیدا کرکے اٹھایا جائے گا؟ ءَ اذا ضللنا فی الارض ءَ انا لفی خلق جدید ط بل ھم بلقاءِ ربھم کٰفرون (۸) جب ہم مٹی میں مل کر گم ہوجائیں گے تو کیا ہم از سرِ نو پیدائش میں آئیں گے، بلکہ وہ اپنے رب سے ملاقات ہی کے منکر ہیں۔

جبکہ قرآن کریم نے بڑی قطعیت کے ساتھ انسانی حیات کے بارے میں فرمایا ہے۔ منھا خلقنا کم و فیھا نعید کم و منھا نخرجکم تارۃ اُخریٰ (۹) ہم نے اسی (مٹی سے) تمھیں تخلیق کیا ہے اور اسی میں ہم تمھیں لوٹائیں گے، اور اسی سے ہم تمھیں دوسری مرتبہ پھر نکالیں گے۔ (اسی کو حیات بعد الموت کہتے ہیں) اور اسی طرح کا مضمون سورۂ النجم میں آیا ہے۔ وانّ علیہ انشاۃ الاخریٰ (۱۰) اور یہ کہ (مرنے کے بعد) دوبارہ زندہ کرنا اسی کا کام ہے۔

دراصل اکثر انسانوں نے خود کو حیوانی سطح کی ایک ایسی مخلوق سمجھا ہوا ہے، جو صرف نطق کی بنیاد پر، حیوانات سے ممتاز ہے۔ اسی لئے وہ جانوروں کو حیوانِ مطلق اور خود کو حیوانِ ناطق قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ سورۂ مومنون میں جہاں انسانی جنین کے مختلف مراحل کو بیان کیا گیا ہے وہیں آخر میں یہ فرمایا گیا ہے۔ ثم انشانٰہُ خلقا آخر (۱۱) پھر ہم نے اسے تخلیق کی دوسری صورت میں نشوونما دی۔ انسانی جنین کا خلقا آخر ہونا وہ غیر معمولی امتیاز ہے، جو صرف انسان کو دیا گیا ہے۔ دیگر حیوانی جنین، اس وصف سے خالی ہیں۔ رحم مادر کے تمام مراحل میں انسانی جنین اور حیوانی جنین میں یہی وہ فرق ہے، جسکی بنیاد پر انسانی زندگی فقط طبیعی تقاضوں تک محدود نہیں رہتی، جیسا کہ دیگر حیوانات کی زندگی ان کے طبیعی اجسام کی زندگی سے عبارت ہوتی ہے۔ یعنی جب کسی حیوان پر موت وارد ہوتی ہے تو اسکی زندگی کا ہمیشہ ہمیشہ کیلئے خاتمہ ہوجاتا ہے جبکہ انسانی زندگی ان سے بایں طور متغائر اور منفرد ہے کہ وہ جسمانی موت کے وارد ہونے سے فنا نہیں

ہوتی بلکہ زندگی دوسرے مرحلے میں داخل ہو جاتی ہے، جسے موت کہتے ہیں اور یہ موت بھی دراصل حیات ہی کا تسلسل ہے گویا

(۱۲) Death is a natural part of life.

اور اقبالؒ کی زبان میں

تُو اسے پیمانہ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں ، پیہم رواں، ہر دم جواں ہے زندگی

موت و حیات کے حوالے سے دنیا میں دو قسم کے نظریات شروع سے پائے جاتے ہیں۔ ایک نظریہ کی رو سے نہ خدا ہے اور نہ آخرت۔ اس نظریہ کو دہریت یا بالفاظِ دیگر مادیت کا نظریہ حیات کہا جاتا ہے۔ اور اس پر متفرع نظام کو سیکولر۔ سیکولرازم میں قانون کا ماخذ خود معاشرہ ہوتا ہے، جو اپنی ضروریات اور تقاضوں کے پیش نظر، خود کوئی قانون بناتا ہے اور خود ہی نظامِ عدل قائم کرتا ہے۔ اس لئے اس نظریۂ حیات کی رو سے قانون سازی اور قانون کی خلاف ورزی کی صورت میں نظامِ تعزیرات دونوں کے دونوں معاشرے کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں۔ معاشرہ جب چاہے اسے بدل دے۔ اس لئے معاشرے کے قائم کردہ قوانین اور اس کے نظام عدل کی عمر بے وفا ہوتی ہے۔ اس میں نہ پائیداری ہے اور نہ قلبی اطمینان اور دوسرا سقم یہ بھی ہے کہ جرم اگر معاشرے سے چھپ کر کیا گیا ہو یا ثابت نہ ہو سکا ہو تو اسپر کسی سزا یا نتیجہ کا احساس پیدا نہیں ہوتا۔

اس کے برعکس دوسرا نظریۂ حیات چونکہ خدا و آخرت پر یقین رکھتا ہے اور خدا کے متعین کردہ قوانین کو ابدی اور غیر متبدل مانتا ہے۔ اس لئے وہ معاشرے کی اخلاقی گراوٹوں کے ساتھ خود کو نہیں بدلتا۔ اور معاشرے سے چھپے ہوئے جرم کو بھی خدا کے قانونِ مکافات کے تحت نتیجہ خیز مانتا ہے۔ اس نظریۂ حیات کی رو سے انسان کا ہر عمل، خدا کے ابدی قوانین کے مطابق اپنا نتیجہ لازماً پیدا کر کے رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے احاطے میں فقط محسوس اعمال ہی نہیں آتے بلکہ دل میں گزرنے والے وسوسے تک اس میں آجاتے ہیں۔ سورۂ مومن میں آیا ہے۔ **یعلم خائنة الاعین وما تخفی الصدور** (۱۳) وہ نگاہوں کی خیانت اور دلوں میں پوشیدہ رازوں سے بھی واقف ہے۔ جہاں تک انسانی اعمال کے نتائج کا تعلق ہے۔ یوں سمجھئے کہ سارا قرآن اس نکتہ کی تفصیل سے بھرا پڑا ہے۔ مثلاً **وانّ کلّا لما لیوفینهم ربک اعمالهم انه بما**

یعملون خبیر (۱۴) بے شک آپ کا رب ان سب کو، ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دے گا۔ یقیناً وہ ان کے کاموں سے اچھی طرح واقف ہے۔ لھا کسبت وعلیھا ما اکتسبت (۱۵) ہر فرد کا عمل خواہ اچھا ہو یا برا وہ اس کیلئے ضرور نتیجہ خیز ہوگا۔

قرآنی فلسفۂ حیات کی رو سے انسان کے ہر عمل کا اثر اس کی ذات پر پڑتا ہے اور انسانی ذات انہی نقوش کو لئے ہوئے اس زندگی میں بھی قائم رہتی ہے اور مرنے کے بعد، آگے بڑھتی رہتی ہے۔ لہٰذا کسی عمل کے بے نتیجہ رہ جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انہی نقوش کو انسان کا اعمال نامہ کہا جاتا ہے۔ آج یہ نقوش نگاہوں سے پوشیدہ ہیں لیکن قیامت میں یہ اس طرح نمودار ہو جائیں گے، جس طرح لیموں کے عرق سے لکھے ہوئے الفاظ، کاغذ کو آگ کے سامنے رکھنے سے خود بخود نمایاں ہو جاتے ہیں۔

البتہ حیاتِ اُخروی کی کیفیت، نوعیت اور صورت کس قسم کی ہوگی اور جنت اور جہنم کی ماہیت کیسی ہوگی اسے ہم اپنے شعور کی موجود سطح پر نہیں جان سکتے۔ جنّت کی متعلق قرآن نے بتایا ہے کہ فلا تعلم نفس ما اخفی لھم من قرۃ اعین (۱۶) کوئی شخص اس زندگی میں نہیں جان سکتا کہ اسکی آنکھوں کی ٹھنڈک کا وہ سامان جسے پوشیدہ رکھا گیا ہے، کیسا ہے؟ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حیاتِ اُخروی کے ضمن میں قرآن کا سارا بیان تمثیلی و تشبیہی رنگ میں آیا ہے۔

زندگی سے متعلق بالعموم فکر انسانی کا تصور دَوری کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جس نقطہ سے زندگی کا آغاز ہوا ہے۔ بالآخر وہ اسی نقطے پر اختتام پذیر ہو جائے گا۔ گویا پھر آگئے وہیں پہ چلے تھے جہاں سے ہم۔ یہ تصور سب سے پہلے یونانیوں نے پیش کیا تھا۔ دراصل یونانی مفکرین نے اجرام سماوی کو گول پایا۔ جس سے انہوں نے دائرہ کا تصور اخذ کیا اور یہ نظریہ قائم کیا کہ کائنات اور انسان کی زندگی کی حرکت دوری ہے۔ بالفاظ دیگر یہ دائرے کے اندر گردش کر رہی ہے۔ اسی دائرے کے پیش نظر فیثا غورس نے تناسخ (Transmigration of Soul) کا نظریہ وضع کیا۔ یہ دوری تصور نظریۂ تناسخ تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ مذاہب عالم میں نجات کا نظریہ بھی اسی تصور کا پیدا کردہ ہے۔ جس کے تحت جہنم کی مثال دھوبی کی بھٹی سے دی جاتی ہے جہاں جہنمیوں کو میل کچیل سے صاف کر کے بالآخر جنت میں ڈال جائے گا۔

اسی تصور کو ہندوؤں کی ویدانت میں یوں کہا گیا ہے کہ انسانی روح (آتما) برہما کی روحِ عظیم (پرماتما) کا جُزو ہے اور اسی جُزو کو بالآخر اپنے کل سے جا ملنا ہے۔ بدھ مت کا نروان بھی کچھ ایسا ہی تصور پیش

کرتا ہے۔ زندگی کے اسی دَوری تصور نے مسلمانوں پر بھی اپنا اثر ڈالا ہے۔ بالخصوص تصوف پر، مولانا رومؒ نے اپنی مثنوی میں کہا ہے:

بشنواز نَے چوں حکایت می کند
از جدائی ہا، شکایت میں کند

یعنی بانسری اس لئے آہ وفغاں کرتی ہے کہ وہ اپنی اصل سے جدا ہوگئی ہے۔ ہماری اردو شاعری بھی اس اثر سے خالی نہیں ہے۔ غالب کے الفاظ میں یہ تصور کتنا نمایاں ہے ع عشرتِ قطرہ ہے، دریا میں فنا ہوجانا

جبکہ قرآن کریم کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ انسانی زندگی کا تصور دَوری نہیں بلکہ صراطی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ زندگی اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی چلی جارہی ہے۔ اھدنا الصراط المستقیم میں اسی صراطی تصور کا ذکر کیا گیا ہے، جو زندگی کے توازن بدوش رستے پر مسلسل حرکت سے عبارت ہے۔ اس لئے انسانی زندگی کا مقصد فقط نجات نہیں (جیسا کہ تمام مذاہب کا ہے) بلکہ نجات سے آگے کا ہے۔ جسے فوزِ عظیم یعنی بڑی کامیابی قرار دیا گیا ہے۔ لترکبن طبقا عن طبق (۱۷) تاکہ انسان درجہ بدرجہ بلندیوں کی طرف چڑھتا چلا جائے۔ یہ ہے زندگی کا وہ تصور، جس سے مغرب ہنوز نا آشنا ہے۔

قرآن کریم میں موت کا لفظ حیات کے مقابلے میں آیا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ موت مطلق عدم کو نہیں کہتے۔ جس طرح سردی نام ہے گرمی کے نہ ہونے کا اور سکون نام ہے حرکت کے نہ ہونے کا۔ ظاہر ہے کہ اس ضد میں وہ امتیاز پایا جاتا ہے، جو عدم مطلق میں نہیں پایا جاتا۔ پس اللہ تعالیٰ موت سے حیات اور حیات سے موت پیدا فرماتا ہے اور ایک بار پھر موت سے حیات کو پیدا فرمائے گا۔ کیف تکفرون باللہ و کنتم امواتاً فاحیاکم ثم یمیتکم ثم یحییکم ثم الیہ ترجعون (۱۸) تم کس طرح اللہ کا انکار کرتے ہو۔ اور تم مردہ تھے۔ پھر اس نے تمھیں حیات بخشی، پھر وہ تم کو موت دے گا اور پھر تمہیں زندہ کرے گا۔ پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

سورۂ ملک کی آیت کی طرح اس آیت میں بھی پہلے موت کا ذکر کیا گیا ہے، پھر زندگی کا مگر اس فرق کے ساتھ کہ اس میں دو موتوں اور دو زندگیوں کا اکٹھا ذکر ہے۔ پہلی موت سے مراد یقیناً عدم محض ہے یعنی نیستی کی حالت، جیسا کہ ایک جگہ آتا ہے۔ ھل اتیٰ علی الانسان حین من الدھر لم یکن شیاء

مذکوراً (۱۹) یقیناً انسان پر زمانے کا ایک ایسا وقت گزر چکا ہے کہ وہ کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا۔ یہی انسان کا عدمِ محض میں ہونا ہے اور دوسرے موت سے مراد انسان کا طبیعی موت مرنا ہے۔ جو اس دنیا میں واقع ہوتا ہے۔ اسی طرح پہلی حیات سے مراد، انسان کا نیستی سے ہستی میں وجود پذیر ہونا ہے، جبکہ دوسری حیات سے مراد، انسان کی بعثتِ ثانی ہے، جس کے بعد رب تعالیٰ کے حضور سب کی حاضری ہونی ہے۔ اسی حقیقت کو دوسری جگہ دو موتیں اور دو زندگیاں کہہ کر پکارا گیا ہے۔ قالوا ربنا امتنا اثنتین و احییتنا اثنتین فاعترفنا بذنوبنا فھل الیٰ خروج من سبیل (۲۰) کہیں گے ہائے ہمارے رب! تو نے ہم پر دو موتیں وارد کیں اور دو دفعہ ہمیں زندہ کیا۔ سو ہم اپنے گناہوں کا اقرار کرتے ہیں تو کیا یہاں سے نکلنے کی کوئی راہ ہے۔ اور بعثتِ ثانی کیلئے کہا کہ اس کے بعد پھر موت وارد نہیں ہوگی۔ افما نحن بمیتین. الا موتتنا الاولیٰ وما نحن بمعذبین (۲۱) تو کیا (یہ سچ نہیں کہ) ہم مرنے والے نہیں، بجز پہلی موت کے (جو واقع ہو چکی) اور نہ ہی ہمیں عذاب دیا جائے گا۔ یہ آیت جنتیوں کے مکالمے پر مشتمل ہے اور یہ اس کے مطابق ہے، جو دوسری جگہ فرمایا ہے: لا یذوقون فیھا الموت الا موتة الاولیٰ ووقٰھم عذاب الجحیم (۲۲) اس میں کوئی موت نہیں چکھیں گے، سوائے پہلی موت کے (جو چکھ چکے) اور اس نے انہیں دوزخ کے عذاب سے بچالیا۔

یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ موت کے لغوی معنیٰ ظاہر کر دیئے جائیں تاکہ حیات کا مفہوم ایک نئے انداز میں واضح ہو جائے کیونکہ حیات ایک پہلو سے نقیضِ موت بھی ہے۔ اس لئے کسی ایک لفظ کی وضاحت سے دوسرے لفظ کی وضاحت آپ سے آپ ہو جائے گی۔ امام راغب اصفہانیؒ (متوفی ۵۰۲ھ) نے موت کے متعدد معنیٰ لکھے ہیں:

اوّل: قوت نامیہ (جو حیوانات اور نباتات دونوں میں پائی جاتی ہے) کا نہ ہونا۔ جیسے اعلموا انّ اللہ یحیی الارض بعد موتھا (۲۳) جان لو کہ اللہ ہی زمین کو اس کی مُردنی کے بعد زندہ کرتا ہے۔

دوم: قوت حسّی کا زائل ہونا۔ جیسے بیہوش ہو جانا، یہی معنیٰ درج ذیل آیت میں لئے گئے ہیں۔ قالت یلیتنی متُّ قبل ھٰذا و کنت نسیا منیا (۲۴) مریم نے کہا، اے کاش! میں پہلے سے مرگئی ہوتی اور بالکل بھولی بسری ہو چکی ہوتی۔

سوم: قوتِ عقلی کا زائل ہونا، جس کے سبب انسان ہدایت سے محروم رہتا ہے۔ جیسے جہالت۔ اَوَمَن کان میتاً فاحییٰنٰہ (۲۵) پھر ہم اسے ہدایت کی بدولت زندہ کیا۔ حضرت ابن عباسؓ سے یہاں

میّت کے معنیٰ کافر، ضال اور احیاء سے مراد ہدایت ہے۔ (تفسیر روح المعانی) اور ایک شاعر نے کہا ہے:

اَسمعتَ لو ناديت حيّا

ولكن لا حياة لمن تنادى

اگر تو کسی زندہ کو پکارتا تو وہ سن لیتا لیکن جس کو تو پکار رہا ہے۔ اس میں زندگی نہیں ہے۔ (یعنی عقل سے محروم ہے)۔

چہارم: وہ غم جو زندگی میں تکدّر پیدا کر دیتا ہے۔ جیسے یتجرعُه ولا یکاد یسیغه و یاتیه الموت من کل مکان وماهو بمیت۔

وہ بمشکل ایک ایک گھونٹ پیئے گا اور اسے حلق سے نیچے اتار نہ سکے گا اور اسے ہر طرف سے موت آگھیرے گی اور وہ مر نہ سکے گا۔ یہاں موت سے مراد وہ دکھ اور مصائب ہیں، جو موت تک پہنچا دیتے ہیں، مگر چونکہ موت وہاں نہیں ہے، اس لئے وہ مرتا نہیں۔ لا یموت فیها ولا یحییٰ (۲۷)

پنجم: اس کے معنیٰ نیند کے ہیں چنانچہ نیند کو موتِ خفیف اور موت کو نوم مثل کہا جاتا ہے (النوم موت خفیفٌ والموت نوم ثقیل) اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو تُوفّی سے تعبیر کیا ہے۔ وهوا لذی یتوفٰکم بالیل (۲۸) اور وہی ہے، جو رات کے وقت تمہاری روح قبض فرماتا ہے۔ اللّٰه یتوفی الانفس حین موتها والتی لم تمت فی منامها (۲۹) اللہ جانوں کو ان کی موت کے وقت قبض کر لیتا ہے اور ان (جانوں) کو جنہیں موت نہیں آئی، ان کی نیند کی حالت میں۔ پھر ان کو روک لیتا ہے کہ جن پر موت کا حکم صادر ہو چکا ہو اور دوسری جانوں کو مقررہ وقت تک چھوڑے رکھتا ہے۔ اور حدیث میں آتا ہے۔ الحمد للّٰه الذی احیانا بعد ماامتنا جو سو کر اٹھنے کی دعا ہے۔ یعنی سب تعریفات اس کے لئے ہیں، جس نے ہم کو زندہ کیا، بعد اس کے کہ ہمیں مار دیا تھا۔ یہاں احیاء اور اماتت دونوں کا ذکر ہے۔ مگر مراد صرف صرف بیداری اور نیند کے ہیں۔ (۳۰)

ششم: روح کی جسم سے مفارقت۔ یہ عام معنیٰ ہے اور لسان العرب کے مطابق موت کا لفظ کبھی استعارۃً احوالِ شاقہ پر بھی بولا جاتا ہے۔ جیسے فقر و ذلت اور سوال اور بڑھاپا اور معصیت وغیرہ اور موت کے معنیٰ غشی بھی ہیں۔

قبضِ نفس چونکہ نیند کے وقت بھی ہوتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ قبض نوم کی حقیقت بھی ظاہر

کردی جائے۔نوم کی تفسیر سورۂ زمر کی آیت نمبر ۴۲ میں ملتی ہے۔یعنی موت کے بغیر نفس کو قبض کر لینے کا نام نوم ہے۔اور اس کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے کہ دماغ کے اعصاب کے ڈھیلے پڑ جانے کا نام نیند ہے۔ ان بخارات کی رطوبتوں کے سبب، جو اس کی طرف چڑھتے ہیں۔(۳۱) یہاں اللہ تعالی نے توفیٰ نفس کا قانون بیان فرمایا ہے اور بتایا ہے کہ توفیٰ نفس دو وقتوں میں ہوتا ہے۔ایک موت کے وقت، دوسرا نیند کے وقت۔اس امر میں یہ آیت فیصلہ کن ہے کہ تُوفیٰ میں وہ کیا چیز ہے، جو اللہ تعالیٰ لیتا ہے۔یہاں توفیٰ کا مفعول انفس ہے، جو نفس کی جمع ہے۔اور نفس کے معنیٰ حسب ذیل ہیں۔(۱) روحِ حیوانی (سانس) (۲) نفسِ ناطقہ (یعنی تمیز و شعور) (۳) سارا انسان۔توفیٰ میں وہ کیا چیز ہے، جو لی جاتی ہے؟ ظاہر ہے کہ سارا انسان نہیں لیا جاتا کیونکہ نیند اور موت دونوں میں جسم یہیں رہ جاتا ہے۔اس لئے جب کسی کے متعلق توفّے کا لفظ بولا جائے گا تو اس سے مراد جسم کا جانا یا اس کا لے جانا نہیں ہوسکتا۔اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ پھر کیا روحِ حیوانی لی جاتی ہے؟ یہ بھی ظاہر ہے کہ نیند میں روحِ حیوانی موجود رہتی ہے۔اس لئے ماننا پڑتا ہے کہ وہ بھی نہیں لی جاتی۔اب صرف ایک ہی صورت باقی رہ جاتی ہے اور وہ ہے نفس ناطقہ یا وہ چیز جس سے عقل شعور ہے اور یہی صحیح ہے۔اس کے صحیح ہونے کے قرائن یہ ہیں۔

ا۔توفیٰ کا لفظ صرف انسانوں پر بولا گیا ہے، دوسری مخلوقات پر نہیں۔اگر روحِ حیوانی (سانس) کا لیا جانا مراد ہوتا تو یہی لفظ دوسرے حیوانات پر بھی بولا جاتا ہے۔

۲۔نیند اور موت دونوں میں جو چیز لی جاتی ہے۔وہ عقل و شعور اور تمیز ہی ہے، کیونکہ اس کے سوا اور کوئی چیز نہیں جو دونوں میں مشترک ہو۔

۳۔جس غرض کیلئے توفیٔ نفس ہوتا ہے۔وہ جزائے اعمال ہے، اور کسبِ فعل میں گو جسم اور روحِ حیوانی (سانس) دونوں شریک ہوتے ہیں۔مگر اعمال کی ذمہ داری اور ان کا احساس اصلاً تمیز یا عقل انسانی سے ہی پیدا ہوتا ہے۔اسلئے وہی چیز لی جانی چاہیے جس پر اصل ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ابن آدم میں ایک نفس ہے اور ایک روح، اور ان دونوں کے درمیان سورج کی شعاع کا سا تعلق ہے اور نفس تو وہ ہے، جس سے عقل و تمیز ہے اور روح وہ ہے، جس سے انسان سانس لیتا ہے اور حرکت کرتا ہے۔سو موت کے وقت دونوں لئے جاتے ہیں اور نیند میں صرف نفس لیا جاتا ہے اور یہ نفس و روح میں فرق کے متعلق ایک قول ہے۔(۳۲) بعض نے روح اور نفس میں

فرق کیا ہے کہ روح وہ ہے، جس سے زندگی ہے اور نفس وہ ہے جس سے عقل ہے۔ زجاج کا قول ہے کہ ہر انسان کے دو نفس ہیں یعنی حیات اور تمیز نیند میں یہی موخر الذکر نفس قبض کیا جاتا ہے۔ (۳۳)

غلام احمد پرویز، نفس انسانی کے موضوع پر رقمطراز ہیں:

''میکانیکی تصور حیات کی رو سے غیر ذی حیات مادہ میں کسی نہ کسی طرح زندگی پیدا ہوگئی ہے اور پھر زندگی اپنے ارتقائی مراحل طے کرتی ہوئی اس مقام تک آ گئی ہے، جہاں اس میں شعور پیدا ہوگیا۔ یہ شعور اسی طرح میکانیکی قوانین کا پابند ہے، جس طرح غیر ذی حیات مادّہ۔ وہ کہتے ہیں کہ شعور دماغ میں سے پیدا ہوتا ہے اور دماغ چونکہ مادی چیز ہے، اس لئے شعور مادّہ کی پیداوار ہے۔ لیکن تحقیق جدید نے اس تمام مفروضہ کو غلط ثابت کر دیا ہے۔ اب یہ نظریہ قائم ہوا ہے کہ شعور دماغ کی پیداوار نہیں۔ شعور اپنی ہستی الگ رکھتا ہے۔ لیکن دماغ وہ ذریعہ یا آلہ ہے جس کی وساطت سے شعور اپنے آپ کو مشہود (manifest) کرتا ہے۔ جیسے آپ کا ریڈیو سیٹ، جب سیٹ درست حالت میں ہو تو اس میں سے آواز آتی ہے۔ لیکن وہ آواز سیٹ کی پیداوار نہیں ہوتی۔ آواز فضا کی لہروں میں الگ موجود ہوتی ہے۔ لیکن وہ اپنا مظاہرہ ریڈیو سیٹ کی وساطت سے کرتی ہے۔ جب سیٹ خراب ہو جائے تو اس میں سے آواز آنی بند ہو جاتی ہے۔ حالانکہ فضاء میں وہ آواز اب بھی اسی طرح موجود ہوتی ہے۔ جس طرح پہلے موجود تھی۔ جو تعلق ریڈیو سیٹ اور فضاء میں بکھری ہوئی آواز کا ہے۔ وہ تعلق دماغ اور شعور کا ہے۔ شعور اپنے طور پر موجود ہوتا ہے۔ صرف اپنا مظاہرہ دماغ کے ذریعے کرتا ہے۔ انسانی شعور کے مقام کو نفسِ انسانی (mind) یا (psyche) کہا جاتا ہے۔ نفسِ انسانی مادّہ کی پیداوار نہیں ہوتا۔ یہ اپنا تشخص الگ رکھتا ہے۔ اس کے اسی تشخص کا نام انسانی انا یا الغو (I or Ego) ہے۔ (۳۴)

سورۂ زمر کی آیت نمبر ۴۲ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہر موت، قضائے الٰہی سے آتی ہے نہ کہ رضائے الٰہی سے، فیمسک التی قضیٰ علیھا الموت۔ مثال کے طور پر جب کسی شخص کو ناحق قتل کیا جاتا ہے تو اس قتل کو خدا کی رضا کبھی حاصل نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ قتل حکم خداوندی کے خلاف واقع ہوتا ہے۔ پس اس طرح کی اموات کو قضائے الٰہی سے تعبیر کیا جائے گا۔۔۔۔ البتہ۔۔۔۔ جب کسی قاتل کو قصاص میں قتل کیا جاتا ہے تو اس فعل کو خدا کی رضا حاصل ہونے کے سبب رضائے الٰہی سے تعبیر کیا جائے گا کیونکہ قصاص میں قتل کرنا امر خداوندی کی تعمیل ہے اور قانون خداوندی کی اتباع سے ہی رضائے الٰہی کا حصول ممکن

ہے۔ بہرحال موت، خواہ قضائے الٰہی سے آئے یا رضائے الٰہی سے۔ دونوں صورتوں میں اس پر قضا کا اطلاق ہوگا۔ وما کان لنفس ان تموت الا باذن اللہ کتٰبا موجلا (۳۵) اور کسی کو یہ اختیار نہیں کہ وہ (خود سے) مرجائے (یعنی خود اپنی جان ختم کرلے) مگر اللہ کے قانون کے مطابق (موت حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے) جو وقت مقررہ پر لکھی ہوتی ہے۔

جب کسی شخص کی موت کے اسباب مہیا ہوجاتے ہیں تو اس کے موثر ہونے کی انتہائی وقت پر اس کی موت واقع ہوجاتی ہے۔ مثلاً مسافروں سے بھری ہوئی بس حادثے کا شکار ہوجاتی ہے تو بیک وقت مختلف افراد پر مختلف اثرات ظاہر ہوتے ہیں یعنی ان میں سے بعض موقع پر ہی ہلاک ہوجاتے ہیں بعض ہسپتال جاتے وقت راستے میں دم توڑ دیتے ہیں اور بعض ہسپتال پہنچ کر اللہ کو پیارے ہوجاتے ہیں اور بعض کوئی دنوں کے بعد موت آتی ہے۔ غرض یہ سب کتٰبا مؤجلا کی تفسیر ہوتے ہیں۔ توضیح مزید یہ کہ جن پر موت کے اسباب وارد ہی نہیں ہوتے یعنی حادثے کے وقت وہ کسی اوٹ میں آجاتے ہیں تو وہ بال بال بچ جاتے ہیں اور جن پر موت کے اسباب شدت کے ساتھ وارد ہوتے ہیں، وہ موقع پر ہی ہلاک ہوجاتے ہیں اور جن پر موت کے اسباب چند گھنٹوں یا چند دنوں کے بعد مکمل طور پر وارد ہوتے ہیں۔ وہ اسی لحاظ وحساب سے مرتے ہیں۔

الاجل، دراصل کسی کی مدتِ مقررہ کو کہتے ہیں۔ انسان کی زندگی کے لئے، جو مدت مقرر ہوتی ہے، اسے بھی اسی لئے اجل کہا جاتا ہے۔ چنانچہ عربی محاورہ ہے دنا اجلہٗ۔ یعنی اس کی موت کا وقت قریب آپہنچا۔ اصل میں اس کے معنیٰ مدتِ حیات کو پورا کرلینے کے ہیں۔ قرآن میں ہے: وبلغنا اجلنا الذی اجلت لنا (۳۶) ہم اپنی اس میعاد کو پہنچ گئے، جو تو نے ہمارے لئے مقرر فرمائی تھی۔ یہاں اجل سے مراد 'موت کی حد' ہے۔ (۳۷) یعنی موت کا وقتِ نہایت۔ پس موت کے مختلف اسباب ظاہری مثلاً حادثہ، بیماری، آگ میں جلنا، پانی میں ڈوبنا، سیلاب کا آنا، زلزلہ، کسی تیز دھار آلے کی ضرب، بندوق کی گولی، زہر خورانی، شارٹ سرکٹ وغیرہ کے ذریعے جب اسباب موت کے اثرات کا وقت اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے تو موت وقوع، اللہ کے قانون کے مطابق عمل میں آجاتا ہے۔ گویا موت کے لئے اللہ نے جو مشروط قانون مقرر کررکھا ہے۔ جب تک وہ قانون اپنے تقاضے پورے نہیں کرتا، یعنی موت کے اسباب میں سے جب تک کوئی سبب اپنی نہایت کو نہیں پہنچ جاتا۔ اس وقت تک موت وارد نہیں ہوتی۔ البتہ ان ظاہری اسباب سے ہٹ کر طبیعی اموات کا کوئی غیر مشروط داور غیر مرئی (Invisible) سبب ضرور ہوتا ہے، جس کے تحت موت

وارد ہوتی ہے۔

سورۂ آل عمران کی آیت نمبر ۱۴۴ کے مطابق کوئی ذی حیات، خدا کے قانون کے بغیر نہیں مرتا۔ موت اس کے قانون طبیعی کے مطابق واقع ہوتی ہے اور یہی وہ قانونِ طبیعی ہے، جو انسان کی عمر کا تعین کرتا ہے۔ اسی قانون کے تحت عمر گھٹتی اور بڑھتی ہے۔ مثلاً صحت خراب کر لینے سے عمر کم ہو جاتی ہے اور صحت کا خیال رکھنے سے عمر میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ وما یعمر من معمر ولا ینقص من عمرہ الا فی کتاب (۳۸) کسی بڑی عمر والے کو عمر نہیں دی جاتی اور نہ ہی کسی کی عمر میں سے کچھ کمی جاتی ہے۔ مگر (یہ سب کچھ) ایک قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ یعنی عمر کا بڑھنا اور گھٹنا سب خدا کے قانونِ طبیعی کے مطابق ہوتا ہے۔

خدا کے قانون طبیعی کو اس مثال سے بھی سمجھئے۔ فرض کیجئے کہ راستے میں ایک کنواں ہے، جو کوئی اس سے بچ کر نکلتا ہے، وہ محفوظ رہتا ہے۔ گویا اس کا محفوظ رہنا، خدا کے قانون طبیعی کے مطابق واقع ہوتا ہے۔ اس کے برعکس کوئی شخص کسی غفلت کے سبب یا جان بوجھ کر کنوئیں میں گر جاتا ہے تو اس کے ساتھ دو صورتوں میں سے کوئی ایک صورت لازماً واقع ہوتی ہے۔ یا تو وہ مر جاتا ہے یا چوٹیں لگنے کے سبب زخمی ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس حال تک پہنچنا بھی خدا کے قانونِ طبیعی کے مطابق ہوتا ہے لیکن بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کنوئیں میں گرنے والا بال بال بچ جاتا ہے۔ تو اس کا یہ بچنا بھی اللہ کے قانون کے مطابق عمل میں آتا ہے کیونکہ گرنے والا کسی ایسے زاویے سے گرتا ہے کہ اسے خراش تک نہیں آتی یا کوئی اور چیز اس کے بچاؤ کا سبب بن جاتی ہے۔ جس کا بظاہر ہمیں علم نہیں ہوتا۔ کیونکہ کل من عند اللہ کا مفہوم یہی ہے کہ ہر خیر و شر اور موت و حیات اللہ کے قانونِ مشیت کے مطابق عمل میں آئیں۔

اسی قانون طبیعی کو اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ اس طرح نمایاں کیا ہے: وھو القاھر فوق عبادہ ویرسل علیکم حفظہ حتیٰ اذا جاء احدکم الموت توفتہ رسلنا وھم لایفرطون (۳۹) اور وہی اپنے بندوں پر غالب ہے اور وہ تم پر اپنے نگہبان بھیجتا ہے (جو قانونِ مشیت کی رو سے متعین کئے جاتے ہیں) یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی موت کا وقت آتا ہے تو ہمارے بھیجے ہوئے (ملائکہ) اس کا نفس لے لیتے ہیں اور وہ اپنے کام میں کوئی کوتاہی نہیں کرتے۔ یہاں یرسل علیکم حفظہ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ نے ہمارے لئے کچھ محافظ بصورتِ قانون مقرر کر رکھے ہیں، جن کے مطابق حفاظت میسر آتی ہے۔ یہ نہیں کہ اللہ تو محافظ بھیجتا ہے مگر (نعوذ باللہ) ان کی غفلت سے آئے دن قتل و غارت گری، لوٹ مار، دنگا فساد اور حادثات رونما

ہوتے رہتے ہیں۔ بلکہ حقیقت یہی ہے کہ اللہ نے حفاظت کے قوانین متعین کر دیئے ہیں جن کی عدم تفہیم یا عدم تعمیل سے حفاظت کا قانون غیر موثر ہو جاتا ہے۔ اور مختلف حادثات ظہور پذیر ہو جاتے ہیں۔

قرآن مجید میں یُرسِل کا لفظ، متعدد مقامات پر قوانین جاریہ کے تعین کیلئے ہی آیا ہے۔ جیسے الله الذی یرسل والریاح (۴۰) اللہ ہی ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے۔ مطلب یہ کہ اس نے ہواؤں کے چلنے کا قانون متعین کر رکھا ہے۔ ویسبح الرعد بحمده والملائکه من خیفته و یرسل الصواعق (۴۱) بجلیوں کی چمک اور بادلوں کی گرج بلکہ تمام ملائکہ، قانونِ خداوندی کی ہیبت سے لرزہ بر اندام اپنے اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں سرگرمِ عمل رہتے ہیں تاکہ اس کی ربوبیت اس طرح نکھر کر سامنے آجائے کہ ہر دیکھنے والے کی زبان پر بے ساختہ کلماتِ تحسین جاری ہو جائیں۔ مطلب یہ کہ اس نے بجلیوں اور بادلوں کے لئے بھی ایک قانون بنا رکھا ہے، جس کے مطابق وہ سرگرمِ عمل رہتے ہیں۔ اسی طرح یرسل علیکم حفظہ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ نے تمہاری حفاظت کے لئے کچھ قوانین تجویز کر رکھے ہیں۔ جن کی متابعت اور پاسداری سے حفاظت خداوندی میسر آتی ہے اور عدم متابعت سے اللہ کی امان اٹھ جاتی ہے۔

آیتِ زیر بحث میں رسلنا سے مراد جہاں فرشتوں کو لیا گیا ہے وہیں ظاہراً اسبابِ موت کو بھی لیا گیا ہے۔ اور ان دونوں میں کوئی تعارض نہیں، صرف ظاہر و باطن کا فرق ہے۔ ویسے بھی توفئ نفس کا عمل اصلاً قانونِ خداوندی کی رو سے واقع ہوتا ہے۔ ظاہری عمل ملک الموت کرتا ہے۔ قل یتوفٰکم ملک الموت الذی وکل بکم ثم الیٰ ربکم ترجعون (۴۲) آپ کہہ دیجیے کہ موت کا فرشتہ تمہیں وفات دیتا ہے، جس کے تم سپرد کیئے گئے ہو، پھر تم اپنے رب کی طرف پلٹائے جاؤ گے۔ باقی ملائکہ اس کے ساتھ ہوتے ہیں اور انہی کیلئے یہاں صیغۂ جمع آیا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ رقمطراز ہیں: ''مرشد تھانوی نے فرمایا کہ بعض صوفیہ اس کے قائل ہوئے ہیں کہ قبض ارواح کبھی حق تعالیٰ خود فرماتے ہیں۔ (۴۳) کبھی ملک الموت (۴۴) اور کبھی دوسرے فرشتے (۴۵) (رُسُل) اور یہ متوفٰے کے احوال کے تفاوت پر ہے۔ آیت نے اسے بھی صاف کر دیا کہ اختیار ان ملائکہ کا کچھ بھی نہیں، ان کا کام محض تعمیل احکام ہے۔'' (۴۶)

متوفٰی کے احوال کا تفاوت قرآن مجید میں کئی مقامات پر آیا ہے۔ مثلاً منافقین کی موت کا منظر یوں کھینچا ہے۔ فکیف اذا توفتهم الملائکة یضربون وجوههم وادبارهم (۴۷) پھر (اس وقت

ان کا حشر) کیسا ہوگا جب ملائکہ ان کا نفس اس حال میں نکالیں گے کہ ان کے چہروں اور ان کی پیٹھوں پر ضربیں لگاتے ہوں گے۔ یہ ان مرنے والوں کا حال بیان ہورہا ہے۔ جنہوں نے منافقانہ طرز زندگی کو اختیار کیا۔ (۴۸) جو اللہ کی مرضی کے برخلاف تھی اور جنہوں نے اللہ کی مرضی کو ٹھکرا دیا۔ اسی لئے اللہ تعالی نے بالآخران کے اعمال اکارت کردیئے: **ذلک بانھم اتبعوا مااسخط اللہ وکرھوٰ رضوانہ فاحبط اعمالھم** (۴۹) یہ مار اس وجہ سے پڑی کہ انہوں نے اس (روش) کی پیروی کی، جو اللہ کو ناراض کرتی ہے اور انہوں نے اس کی رضا کو ناپسند کیا تو اس نے ان کے (جملہ) اعمال اکارت کردیئے۔

اور اس آیت میں کفار کی موت کا منظر بایں الفاظ دہرایا گیا ہے۔ **ولو تریٰ اذیتوفی الذین کفروالملائکۃ یضربون وجوھھم وادبارھم** (۵۰) اور اگر آپ وہ منظر دیکھیں تو (بڑا تعجب کریں) جب ملائکہ کافروں کی جان قبض کرتے ہیں۔ وہ ان کے چہروں اور پشتوں پر ضربیں لگاتے جاتے ہیں اور (کہتے جاتے ہیں کہ دوزخ کی) آگ کا عذاب چکھ لو۔

ایک مقام پر استطاعت کے باوجود ہجرت نہ کرنے والوں کی وفات کا منظر اس طرح بیان ہوا ہے: **ان الذین توفٰھم الملائکۃ ظالمی انفسھم قالوا فیم کنتم قالوا کنا مستضعفین فی الارض قالوا الم تکن ارض اللہ واسعۃً فتھاجروا فیھا فاولیک ماوٰھم جھنم وساءَ ت مصیرا. الاالمستضعفین من الرجال والنسآءِ والولدان لایستطیعون حیلۃ ولا یھتدون سبیلا** (۵۱) بے شک جن لوگوں کا نفس، ملائکہ اس حال میں قبض کرتے ہیں کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہیں تو وہ ان سے دریافت کرتے ہیں کہ تم کس حال میں رہے؟ وہ کہتے ہیں کہ ہم زمین میں کمزور و بے بس تھے۔ ملائکہ کہتے ہیں کیا اللہ کی زمین فراخ نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے سو یہی وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بہت بری جگہ ہے۔ سوائے ان مجبور اور بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں (یا غلاموں) کے، جو نہ کسی تدبیر پر قدرت رکھتے ہیں اور نہ (وہاں سے نکلنے کا) کوئی راستہ جانتے ہیں۔ اس آیت میں **ظالمی انفسھم** سے مراد وہ لوگ ہیں، جو دل سے اسلام کے قائل تھے مگر استطاعت کے باوجود مخالفِ اسلام ماحول سے نکل کر ہجرت اختیار نہ کرسکے۔ اس آیت میں ایسے ایمان کے دعویداروں کا انجام بیان ہوا ہے جو کسی بھی زمانے کے ایسے بنیادی تقاضے کو نظرانداز کرتے ہیں۔ جس کی اہمیت دین میں اساسی نوعیت کی ہوتی ہے۔ اس پہلو سے یہ آیت انتہائی قابلِ توجہ ہے۔ مولانا صلاح الدین یوسف نے لکھا ہے۔

''یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ جو مکّہ اور اس کے قرب و جوار میں مسلمان تو ہو چکے تھے لیکن انہوں نے اپنے آبائی علاقے اور خاندان کو چھوڑ کر ہجرت کرنے سے گریز کیا۔ جبکہ مسلمانوں کی قوت کو ایک جگہ مجتمع کرنے کیلئے ہجرت کا نہایت تاکیدی حکم مسلمانوں کو دیا جا چکا تھا۔ اس لئے جن لوگوں نے ہجرت کے حکم پر عمل نہیں کیا۔ ان کو یہاں ظالم قرار دیا گیا ہے اور ان کا ٹھکانہ جہنم بتلایا گیا ہے۔ جس سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ حالات وظروف کے اعتبار سے اسلام کے بعض احکام کفر یا اسلام کے مترادف بن جاتے ہیں۔ جیسے اس موقع پر ہجرت، اسلام اور اس سے گریز کفر کے مترادف قرار پایا۔ دوسرے یہ معلوم ہوا کہ ایسے دارالکفر سے ہجرت کرنا فرض ہے۔ جہاں اسلام کی تعلیمات پر عمل کرنا مشکل ہے اور وہاں رہنا کفر اور اہل کفر کی حوصلہ افزائی کا باعث ہو۔ (۵۲)

ایک اور آیت میں ایسے ہی لوگوں کی موت اور ان کا انجام بایں الفاظ بیان ہوا ہے: **الذین تتوفٰھم الملائکة ظالمی انفسھم فالقوالسلم ما کنّا نعمل من سُوء ط بلیٰ ان اللّٰہ علیم بما کنتم تعملون فادخلوا ابواب جھنم خٰلدین فیھا ط فلبس مثوی المتکبرین** (۵۳) جن کی جانیں فرشتے قبض کرتے ہیں (درآں حال یہ کہ) وہ اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہیں۔ تب وہ فرمانبرداری ظاہر کریں گے۔ (کہیں گے) ہم کوئی بدی نہیں کرتے تھے۔ ہاں اللہ خوب جانتا ہے، جو تم کرتے تھے۔ پس تم دوزخ کے دروازوں سے داخل ہو جاؤ تو تم اس میں ہمیشہ رہنے والے ہو۔ سو تکبر کرنے والوں کا کیا ہی برا ٹھکانہ ہے اور درج ذیل آیت میں سچے اور باکردار مسلمانوں کی موت اور ان کا انجام یوں بیان ہوا ہے: **الذین تتوفھم الملائکة طیبین یقولون سلام علیکم ادخلو الجنة بما کنتم تعملون** (۵۴) جن کی جانیں فرشتے قبض کرتے ہیں (درآں حال یہ کہ) وہ (اپنے عقائد و اعمال میں) پاکیزہ ہوتے ہیں یا وہ اپنی نیکیوں کے سبب خوش و خرم ہوتے ہیں۔ (ان سے فرشتے قبضِ نفس کے وقت ہی کہہ دیتے ہیں) تم پر سلامتی ہو، تم جنت میں داخل ہو جاؤ۔ ان اعمال صالحہ کے باعث، جو تم کرتے تھے۔

مذکورہ بالا ہر آیت میں ملائکہ کا لفظ آیا ہے۔ جو ملک کی جمع ہے۔ واضح رہے کہ بعض مرتبہ جمع سے مقصود صرف جنس کا اظہار ہوتا ہے۔ (۵۵) لیکن اگر اسے بطور جنس کے نہ مانا جائے، تب بھی جمع کی تفسیر اس امر کے اظہار کے لئے ہوتی ہے کہ موت کا فرشتہ اپنے ساتھ دیگر ملائکہ کے ہمراہ آتا ہے، جو اس کے مددگار و معاون ہوتے ہیں یا اس کے عُلوّ کے اظہار کے لئے ہوتے ہیں۔ ظالمی انفسھم کے الفاظ، جس طرح

سورۂ نحل کی آیت نمبر ۲۸ میں آئے ہیں۔ اسی طرح وہ سورۂ نساء کی آیت نمبر ۹۷ میں بھی آئے ہیں۔ اس اشتراکِ لفظی سے پتہ چلتا ہے کہ سورۂ نحل کے الفاظ بھی غالباً مسلمانوں کے لئے استعمال ہوئے ہیں۔ پھر نحل کی آیت نمبر ۳۲ میں طیبین کے مقابلے پر بھی ہیں۔ جن سے مراد پاکیزہ عقائد و اعمال والے لوگ ہیں۔ اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ آیت نمبر ۲۸ میں ظالمی انفسھم سے مراد بدعمل لوگ ہیں، اور انہی کی بداعمالیوں کو ظلمِ نفس سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بہرحال بداعمالیاں، مسلمانوں کی ہوں یا غیر مسلموں کی، اپنے ظہورِ نتائج میں یکساں نظر آتی ہیں۔ گو نحل کی آیت نمبر ۲۸ میں ظالمی انفسھم سے ماقبل آیت میں کفار کا ذکر ہے۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ اصلاً یہ مکالمہ کفار سے ہے۔ مگر سورۂ انفال ۵۰ اور سورۂ محمد ۲۷ کی آیات میں منافقین و کفار کی جانیں قبض کرتے وقت چونکہ ان کے چہروں اور پیٹھوں پر ضربیں لگانے کا ذکر کیا گیا ہے۔ جبکہ یہاں ضربوں کی بجائے مکالمے کا ذکر ہے۔ جیسا کہ سورۂ نساء کی آیت نمبر ۹۷ میں ہے اور مکالمہ چونکہ مسلمانوں سے ہے اس لئے کافروں کے ساتھ اس کے مورد وہ مسلمان ہو سکتے ہیں، جو اپنے اعمال میں کفار کے مشابہ ہوتے ہیں۔ گو ان کا ظاہر تو مسلمانوں والا ہوتا ہے مگر اصلاً وہ کافر ہوتے ہیں۔ اس فرق سے ظالمی انفسھم کے اشتراکِ لفظی میں تطبیق کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔

ذیل میں ایک آیت اور دیکھئے، جو اپنے ظاہرِ عبارت سے خود عیاں ہے کہ اس میں مکالمہ عام کفار سے نہیں بلکہ پیشوائے کفار سے ہے: ومن اظلم ممن افتریٰ علی اللّٰہ کذبا او قال اوحی الّی ولم یوح الیہ شیءٌ وّمن قال سا نزل مثل ما انزل بما کنتم تقولون علی اللّٰہ غیر الحق و کنتم عن ایٰتہ تستکبرون (۵۶) اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا، جو اللہ پر جھوٹا بہتان باندھے یا (نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرتے ہوئے یہ) کہے کہ میری طرف وحی کی گئی۔ حالانکہ اس کی طرف کچھ بھی وحی نہ کی گئی ہو اور جو (خدائی کا جھوٹا دعویٰ کرتے ہوئے یہ) کہے کہ میں بھی اس کی مثل اتار سکتا ہوں، جو اللہ نے اتارا اور اگر آپ (اس وقت کا منظر) دیکھیں۔ جب ظالم لوگ موت کی سختیوں میں ہوں گے اور فرشتے (ان کی طرف) اپنے ہاتھ پھیلائے ہوئے ہوں گے (اور کہیں گے) تم اپنی جانیں (جسموں سے) نکالو۔ آج تمہیں سزا میں ذلت کا عذاب دیا جائے گا۔ اس وجہ سے کہ تم اللہ پر ناحق باتیں کیا کرتے تھے اور تم اس کی آیتوں سے سرکشی کیا کرتے تھے۔

اخرجوا انفسکم میں اخراجِ نفس کی نسبت مرنے والوں کی طرف کی گئی ہے۔ مگر مراد اس سے

ان کی بے بسی اور لاچارگی ہے۔ یعنی زندگی کے حریصوں اور طلب گاروں کے لئے اس سے بڑی سزا کیا ہوسکتی ہے کہ خود ان سے مرنے کو کہہ دیا جائے کہ نکالو اپنی جانوں کو۔ غمرات الموت کے الفاظ میں غمرات بصیغۂ جمع لایا گیا ہے، مطلب یہ کہ ایسے نافرمانوں پر موت کے وقت کوئی ایک سختی نہیں بلکہ بہت سی سختیاں وارد ہوں گی اور کوئی بعید نہیں کہ ان سختیوں میں ان کے چہروں اور پٹھوں پر ضربیں لگانا بھی شامل ہو، گو لفظوں میں یہ سختی بیان نہیں ہوئی مگر غمرات کے لفظ میں یہ مضمر معلوم ہوتی ہے۔ بہرحال غمرات الموت کے مصداق وہ لوگ ہیں جو اپنی سرکشی میں عام کفار سے بڑھے ہوئے ہوتے ہیں، یعنی خود کو نبی اور خدا کے مقام پر فائز سمجھ کر، خدا اور رسول کا مذاق بناتے ہیں۔

قرآن کریم نے موت کو یقینی امر قرار دیتے ہوئے فرمایا: اینما تکونوا یدرککم الموت ولو کنتم فی بروج مشیدہ (۵۷) تم جہاں کہیں ہوگے، موت تمہیں وہیں آلے گی، خواہ تم مضبوط قلعوں ہی میں (کیوں نہ) ہو۔ اس آیت نے بتا دیا ہے کہ موت ایک ایسا یقینی امر ہے، جس سے مفر ممکن نہیں ہے۔ خواہ تم کچھ بھی کرلو۔ مگر خود کو موت سے نہیں بچا سکتے۔ روزِ قیامت کفار کے مکالمے کا ذکر کرتے ہوئے قرآن نے بتایا کہ وہ اپنی دیگر گمراہیوں کے ساتھ اس گمراہی کا بھی ذکر کریں گے کہ: وکنا نکذب بیوم الدین. حتیٰ اتنا الیقین (۵۸) اور ہم جزا و سزا کے دن کو جھٹلاتے تھے، یہاں تک کہ موت نے ہمیں آلیا۔ اور ایک دوسرے مقام پر بھی قرآن نے اسی لئے موت کو یقین کے لفظ سے یاد کیا ہے: وعبد ربک حتیٰ یاتیک الیقین (۵۹) اور اپنے رب کی عبادت کرتے رہیے یہاں تک کہ آپ کے پاس پیغامِ اجل آجائے۔

ان دونوں آیتوں میں بالعموم یقین کے مجازی معنیٰ موت کے لیے گئے ہیں۔ کیونکہ موت ایک ایسا یقینی امر ہے جس سے ہر زندہ شخص کو لاحق ہونا ہے۔ ایک حدیث میں بھی حضرت عثمان بن مظعونؓ کی شہادت کے سلسلے میں لفظ ''یقین'' اسی معنیٰ میں آیا ہے۔ اما ھو فقد جآءہ الیقین والی لارجو لہ الخیر (۶۰) یقین کا اطلاق چونکہ ہر یقینی شے پر ہوتا ہے۔ خواہ وہ دینی ہو یا دنیوی اور وہ بھی بغیر تخصیص زمانہ کے۔ یعنی ماضی و حال کی طرح مستقبل کی کسی شے پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ ایسی شے کہ جس کے وقوع میں شک نہ ہو۔ اس معنیٰ کی رُو سے موت کے ساتھ ساتھ قیامت کو بھی یقینی امر سے تعبیر کیا گیا ہے اس لئے بعض علماء نے سورۂ مدثر کی آیت نمبر ۴۷ پر قیامت کا اطلاق کیا ہے۔ (۶۱)

بہرحال یہ ہے اسلام کا وہ تصور موت، جس سے مفر ممکن نہیں بلکہ محال ہے۔ جبکہ دوسری طرف مغرب کی خواہش و کوشش اس محال کو ممکن بنانے کی ہے۔ ورلڈ بک انسائیکلوپیڈیا میں Death کے عنوان سے لکھا گیا ہے۔

> On the other hand, some people find death a threatening prospect and choose to deny it or try to avoid it. Still others regard death as the greatest possible challenge. They seek to delay the aging process or to defeat death itslef through medical science or by other means. (62)

ظاہر ہے کہ موت کے بارے میں اس طرز فکر نے ان کی زندگی کے نصب العین کو متعین کر دیا ہے۔ جو کھلم کھلا حیات بعد الموت کے عقیدے کے برعکس ہے اور اسی مادی طرزِ فکر کی بنیاد پر، اسلام اور مغرب میں بعد المشرقین پایا جاتا ہے۔

حوالہ جات:

۱۔ القرآن:۶-۲ ۲۔القرآن:۲۹-۵۷

۳۔ القرآن:۲۱-۳۵ ۴۔القرآن:۳-۱۸۵

۵۔ القرآن:۴۷-۱۲ ۶۔القرآن:۳۷-۵۳

۷۔ القرآن:۴۹-۹۸ ۸۔القرآن:۳۲-۱۰

۹۔ القرآن:۲۰-۵۵ ۱۰۔القرآن:۵۳-۴۷

۱۱۔ القرآن:۲۳-۱۴

۱۲۔ دی ورلڈ بک انسائیکلوپیڈیا، جلد پنجم، ص ۵۳، امریکہ، ۱۹۸۵ء

۱۳۔ القرآن:۴۰-۱۹ ۱۴۔القرآن:۱۱-۱۱۱

۱۵۔ القرآن:۲-۲۸۶ ۱۶۔القرآن:۳۲-۱۷

۱۷۔ القرآن:۸۴-۱۹ ۱۸۔القرآن:۲-۲۸

۱۹۔ القرآن:۶۷-۱ ۲۰۔القرآن:۴۰-۱۱

۲۱۔ القرآن:۳۷-۵۸/۵۹ ۲۲۔القرآن:۴۴-۵۶

۲۳۔ القرآن:۵۷-۱۷ ۲۴۔القرآن:۱۹-۲۳

۲۵۔ القرآن:۶-۱۲۲ ۲۶۔القرآن:۱۴-۱۷

۲۷۔ القرآن:۲۰-۷۴ ۲۸۔القرآن:۶-۶۰

۲۹۔ القرآن:۳۹-۴۲

۳۰۔ اصفہانی، راغب، المفردات فی غریب القرآن۔ کتاب المیم و کتاب الحاء، نور محمد، کارخانہ تجارت کتب، آرام باغ، کراچی، سنہ اشاعت درج نہیں۔

۳۱۔ ایضاً، کتاب النون

۳۲۔ آلوسی، محمود، سید (متوفی ۱۲۷۰ھ)، روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی، ص ۸، الجزالرابع و العشرون، مکتبہ امدادیہ، ملتان، مغربی پاکستان، سنہ اشاعت درج نہیں۔

۳۳۔ لسان العرب

۳۴۔ پرویز، غلام احمد، انسان نے کیا سوچا؟ ص ۷۵، ۷۶، طلوعِ اسلام ٹرسٹ، لاہور، ۱۹۹۱ء

۳۵۔ القرآن:۳-۱۴۵ ۳۶۔القرآن:۶-۱۲۸

۳۷۔ اصفہانی، المفردات فی غریب القرآن، کتاب الف۔

۳۸۔ القرآن: ۳۵۔۱۱

۳۹۔ القرآن: ۶۔۶۱ ۴۰۔القرآن: ۳۰۔۴۸

۴۱۔ القرآن: ۱۳۔۱۳ ۴۲۔القرآن: ۳۲۔۱۱

۴۳۔ القرآن: ۱۰/۱۰۴۔۱۶/۷۰۔۳۹/۴۲۔۵۳/۴۴

۴۴۔ القرآن: ۳۲/۱۱ ۴۵۔القرآن: ۴/۹۷۔۸/۵۰۔۱۶/۲۸۔۳۲۔۴۷/۲۷

۴۶۔ دریابادی، عبدالماجد، تفسیر الماجدی، جلد اوّل ص ۲۹۴، زیر حاشیہ آیت الانعام/۶۱۔ تاج کمپنی، کراچی، سنہ اشاعت درج نہیں۔

۴۷۔ القرآن: ۴۷/۲۷ ۴۸۔القرآن: ۴۷/۲۲۔۲۹

۴۹۔ القرآن: ۴۷/۴۹ ۵۰۔القرآن: ۸/۵۰

۵۱۔ القرآن: ۴/۹۷۔۹۸

۵۲۔ یوسف، صلاح الدین، مولانا، اردو ترجمہ قرآن ص ۲۴۸، شاہ فہد قرآن کریم پرنٹنگ کمپلیکس، سعودی عرب، سنہ اشاعت درج نہیں۔

۵۳۔ القرآن: ۱۶/۲۸۔۲۹ ۵۴۔القرآن: ۱۶/۳۲

۵۵۔ اصلاحی، امین احسن، مولانا، تدبر قرآن، جلد دوم ص ۳۶۵، تفسیر زیر آیت النساء/۹۷۔۱۰۰۔ فاران فاونڈیشن، لاہور، طبع اوّل، سنہ ۱۹۸۳ء

۵۶۔ القرآن: ۶/۹۳ ۵۷۔القرآن: ۴/۷۸

۵۸۔ القرآن: ۴/۴۶۔۴۷ ۵۹۔القرآن: ۱۵/۹۹

۶۰۔ امام بخاری، الصحیح البخاری، کتاب الجنائز، رقم الحدیث ۱۱۴۳۔ مسند احمد رقم الحدیث ۲۸۰۰۴

۶۱۔ سعیدی، غلام رسول، تبیان القرآن، جلد ۱۲۔ ص ۳۹۶، لاہور، ۲۰۰۷ء

۶۲۔ دی ورلڈ بک انسائیکلو پیڈیا، جلد پنجم، ص ۵۳، امریکہ، ۱۹۸۵ء